محمود احمد غازی

3

# سوانح اقبالؒ کے مآخذ کا ایک تنقیدی جائزہ

اقبال کی سوانح عمری ہمارے لیے محض اس وجہ سے اہمیت نہیں رکھتی کہ وہ ایک مشہور شخصیت کی سوانح ہے۔ اگرچہ ہر بڑے آدمی کی سوانح اپنے اندر قاری کی دلچسپی کے بہت سے سامان رکھتی ہے۔ تاہم ضروری نہیں کہ اس کی کوئی علمی اہمیت بھی ہو۔ لیکن اقبال کی شخصیت معروف معنوں میں ان "بڑے اور مشہور آدمیوں" سے خاصی مختلف ہے۔ ان کی زندگی اور سوانح کا مطالعہ ہم برصغیر کے مسلمانوں کے لیے گوناگوں اہمیت رکھتا ہے۔ ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے ان کی سوانح کے مطالعہ کی ایک ادبی اہمیت ہے۔ بیسویں صدی میں اردو زبان کے شاعر اعظم نے اپنے ماحول سے کیا اثر لیا، وہ کن ادبی روایات سے متاثر ہوا، اس کی ذاتی شخصیت اور خاندانی پس منظر کا اس کے کلام پر کیا اثر مرتب ہوا۔ پھر اُردو کی ادبی روایات اور بعد کے شعراء پر اس کی شاعری نے کیا کیا اثرات چھوڑے، ان سب سوالات کا صحیح جواب، صحیح پس منظر کے ساتھ اس وقت مل سکتا ہے۔ جب شاعرِ مشرق کی مستند سوانح عمری ناقد کے سامنے ہو۔

ایک بالغ النظر سیاسی مفکر کی حیثیت سے ان کی سوانح کی اہمیت اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ مملکت پاکستان کی بنیاد اقبال کی وہ سیاسی بالغ النظری اور بلند ہمتی تھی۔ جس کے بارے میں ایک معاصر مفکر کی رائے ہے کہ اس کی نظیر اس دور میں عالم اسلام میں مشکل سے ملے گی۔ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی منزل متعین کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کا سیاسی موقف جن مراحل سے گذر کر متشکل ہوا۔ ان میں ایک بڑا مرحلہ اقبال کی قیادت کا بھی رہا ہے۔ اِس اعتبار سے ان کی سوانح مسلم برصغیر کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم اور یقیناً درخشاں باب ہے۔ اقبال نے

مختلف مواقع پر کیا موقف اختیار کیا اور کیوں کیا؟ اپنے سیاسی مواقف کی تشکیل میں وہ کن شخصیات و عوامل سے متاثر ہوئے اور اس کے محرکات کیا تھے؟ ان کے موقف کی تشکیل میں ان کے شخصی رجحانات کا حصہ کس قدر ہے اور بیرونی عوامل کا کس قدر۔ ان سب سوالات کا صحیح جواب برصغیر کی سیاسی تاریخ کو مکمل کرنے کے لیے از حد ضروری ہے۔ پھر خاص طور پر ہم پاکستانیوں کے لیے اقبال کی زندگی اور ان کے پیغام کا مطالعہ ایک نیشنل اہمیت بھی رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی تشکیل و تخلیق کا ایک انوکھا اور منفرد پہلو یہ ہے کہ دنیا کے دوسرے تمام ممالک کے برعکس یہاں پہلے قوم کا تشخص ابھرا اور بعد میں اس قوم کے لیے ایک الگ اور جداگانہ مملکت کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ہمارے ہاں ملک کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو مسلم قومیت کے تصور کو حاصل ہے۔ جس نے پاکستانی قوم کی تشکیل کی۔ ظاہر ہے کہ قوم کا یہ تشخص محض معاشی مفادات کی ہم آہنگی، علاقائی اتصال یا ایسے ہی دوسرے عوامل کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ اس کی اصل بنیاد فکری، نظریاتی اور تہذیبی تھی۔ لہٰذا اس قوم کے فکری نظریاتی اور تہذیبی تشخص کو نمایاں کرنے میں جن اصحاب نے کام کیا ہے ان کی زندگی خود تاریخ کی ایک امانت ہے اور اس کو صحیح صحیح بلاکم و کاست تاریخ میں محفوظ کر دینا اصحاب علم کی مشترکہ ذمہ داری ہے یہ ایک قسم کا فرض کفایہ ہے۔ جس کی ادائیگی پاکستان کے تمام اہلِ قلم کے ذمہ باقی ہے۔ ؎

لیکن ان سب حیثیتوں سے بڑھ کر اقبال کی ایک اور حیثیت بھی ہے اور وہ ایک ایسے آفاقی انسانی مفکر کی ہے جو تمام دنیائے انسانیت کے لیے حق کا ایک پیغام رکھتا ہے۔ اور آدمی کی بحیثیت آدمی تحریم و تکریم کا علمبردار ہے۔ اس لیے اسلامی اور انسانی فکر کی تاریخ میں اقبال کا صحیح اور جائزہ مقام متعین کرنے کے لیے ان کی ایک جامع سوانح حیات کی تدوین ایک لازمی امر ہے۔ بلاشبہ اقبال مسلم برصغیر میں شاہ ولی اللہ کے بعد سب سے بڑے مفکر ہیں۔ ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم جدید نے اس صدی کے اندر ان سے بہتر نمونہ پیش نہیں کیا، ان کو جدید مشرق کا سب سے زیادہ بالغ نظر مفکر قرار دیا جا سکتا ہے مشرق کے اہلِ نظر اور ذہین افراد میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے مغربی تہذیب و افکار کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اس قدر جرأت کے ساتھ اس پر تنقید کی ہو ؎۔ بلکہ اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ ان دونوں

---

؎ - سید ابوالحسن علی ندوی، عالم اسلام میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔ ص ۸۹ - ۹۰

جلیل القدر مفکرین نے اپنے اپنے زمانہ کے ہندوستان پر فکری اعتبار سے کیا اثر ڈالا تو اقبال شاہ ولی اللہ سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ برصغیر میں جن معدودے چند اصحاب نے اپنے معاصر مسلم ہندوستان کے فکری رخ کو بدلنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان میں اقبال بھی شامل ہیں۔

لیکن یہ بڑے افسوس اور افسوس سے زیادہ حیرت اور شرم کی بات ہے کہ اقبال کی وفات کے آج تقریباً ۳۹ سال بعد بھی ان کی کوئی ایسی جامع سوانح حیات نہیں لکھی جاسکی، جو علمی انداز میں مستند معلومات کے ساتھ ان تمام ضروریات کو پورا کرے۔ جن کی وجہ سے سوانح اقبال کا مطالعہ ہمارے لیے ضروری ہے۔ اقبال کے خیالات کی اساس پر جو مملکت بنی تھی۔ اس کو بنے ہوئے تین عشرے گذر چکے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر اقبال کے نام پر ادارے بھی قائم ہیں جو برسوں سے کام کررہے ہیں جا بجا اقبالیات کے شعبے کھل رہے ہیں۔ لیکن اس بنیادی کام کا شاید ابھی تک اچھی طرح آغاز بھی نہیں ہو سکا۔ اقبال کے اپنے معاصرین اور فوری پیش روؤں میں سے شاید ہی کوئی ایسا شخص بچا ہو۔ جس کے رفقاء اور تلامذہ نے اس کی سوانح مرتب نہ کردی ہو۔ سرسید کو الطاف حسین حالی جیسا مخلص اور صاحب قلم رفیق کار ملا، جس نے حیات جاوید لکھ کر سرسیّد کی زندگی کو زندہ جاوید کردیا۔ حیات شبلی لکھنے کے لیے شبلی کے تلامذہ میں سید سلیمان ندوی جیسا محقق اور ادیب اُٹھ کھڑا ہوا۔ محمد علی جوہر کی زندگی کو ان کے دیرینہ رفیق مولانا عبدالماجد دریا بادی نے دو جلدوں میں مرتب کردیا۔ یہ سارا لٹریچر نہ صرف متعلقہ شخصیات کی زندگی پر مستند اور رقیع معلومات فراہم کرتا ہے۔ بلکہ ان کتابوں نے اب خود اُردو کے سوانحی ادب میں کلاسکس CLASSICS کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ ان جلیل القدر شخصیتوں کی سوانح حیات اور پھر ایسے صاحب طرز ادیبوں کے قلم سے دو آتشہ سہ آتشہ ہوجاتی ہے۔

5

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا

لیکن اقبال کو نہ تو ایسا کوئی رفیق کار ملا اور نہ اس کے حلقہ معتقدین میں کوئی ایسا باہمت شخص اٹھا جو یہ کام اس معیار کا کر ڈالتا۔ یہاں کسی کی شخصیت پر بے جا تنقید کرنا مقصود نہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ اس کام کے لیے اگر کوئی شخص سب سے زیادہ موزوں ہوسکتا تھا، تو وہ مرحوم مولانا غلام رسول مہر تھے۔ مولانا سالہا سال تک اقبال کے قریبی دوستوں میں رہے۔ کئی بار ان کے ہمراہی یا سیکرٹری

کی حیثیت میں ہندوستان اور بیرون ہندوستان کا سفر کیا۔ علم و تحقیق میں مولانا کا جو منفرد انداز تھا، وہ معلوم ہے۔ پھر اقبال کے کلام، فلسفہ اور پیغام پر ان کی نظر اس قدر وسیع تھی کہ وہ "ماہر اقبالیات" کے لقب سے پکارے جاتے تھے (ص۱۲ اقبال اور بھوپال از صہبا لکھنوتی) لیکن افسوس ہے مولانا یہ اہم خدمت نہ کر سکے۔ اور دنیا سے چلے گئے۔ ان کے دوسرے دوستوں، ہمراہیوں اور مداحوں میں چودھری محمد حسین، فقیر سید وحید الدین اور سر شیخ عبدالقادر تھے۔ جو علم و فضل کے اس مقام پر تھے کہ کسی حد تک اس کام کو کر سکتے تھے۔ لیکن یہ اصحاب ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں۔ مداحین اقبال میں جو اصحاب ابھی بقید حیات ہیں۔ ان میں ہندوستان میں ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین اور پاکستان میں سید نذیر نیازی صاحب اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ہیں۔ جو اقبال کو بہت قریب سے دیکھتے رہے ہیں اور ان پر لکھ بھی سکتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی جیسا عاشق اقبال جو اپنے کو فخریہ 'اقبالی' کہتا ہے اور مدراس میں اقبال کے عظیم الشان استقبال کو دیکھ کر اس کے دل پر جو کیفیات گذرتی ہیں ان کا اندازہ صرف مہر صاحب جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ایسا شخص سوانح اقبال کی تدوین جیسے اہم اور بنیادی معاملہ کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

(ص۲۱۷ گفتار اقبال)

6

گذشتہ نصف صدی میں اقبال پر جو سوانحی مواد سامنے آیا ہے۔ ممکن ہے وہ بہ حیثیت مجموعی اس ضرورت کو کسی حد تک پورا کر دیتا ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ سارا مواد رطب و یابس سے پُر ہے۔ ہر لکھنے والے نے اپنے مخصوص نظریات کی عینک سے اقبال کو دیکھا اور وہی رنگ ان کی زندگی پر کر ڈالا۔ یوں تو ہر شخص کی زندگی اور سوانح حیات کے مطالعہ کے وقت یہ اصول پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ سوانح نگار کے اپنے عقائد و نظریات کیا ہیں اور کس حد تک ان کی جھلک اس کی تحریر میں آئی ہے۔ لیکن جہاں تک اقبال کی سوانحات کا تعلق ہے وہاں اس باب میں کچھ زیادہ ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اقبال کے مداحوں میں قریب قریب ہر مکتب خیال کے لوگ شامل تھے اور ہیں۔ ان کی کیفیت مولانا روم سے مختلف نہ تھی، جن کو مدت العمر شکایت رہی:

ہر کسے از ظن خود شد یار من
از درون من نجست اسرار من

یہی معاملہ اقبال کے ساتھ بھی تھا۔ مثال کے طور پر امرتسر کے مولانا محمد حسین عرشی جن کا میلان فرقہ

اہلِ قرآن کی طرف تھا۔ اقبال کو اہلِ قرآن میں سے ثابت کرتے ہیں۔ انہوں نے دسمبر ۱۹۳۹ء میں اپنے رسالہ البیان کا اقبال نمبر شائع کیا۔ جس میں اکثر و بیشتر بلکہ تمام تر ان گفتگوؤں کو مدارِ بحث بنایا گیا جو بقول عرشی صاحب اقبال نے ان سے کی تھیں۔ اور جن میں انکارِ حدیث کی طرف واضح اشارات موجود ہیں۔ (البیان۔ دسمبر ۱۹۳۹ء صہ ۱۹، ۲۴ وغیرہ) 7

عرشی صاحب کے انہی بیانات کی بنیاد پر مولانا عبدالسلام ندوی صاحب نے اقبال کامل میں قطعی فیصلہ سنا دیا ہے کہ اقبال کا تعلق فرقہ اہل قرآن سے تھا۔ (اقبال کامل صہ ۵۵ — ۵۶) یہی بات سب سے زیادہ کھل کر ملفوظات اقبال نامی مجموعہ میں سامنے آتی ہے۔ یہ مجموعہ محمود نظامی صاحب نے ۳۸ء ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ اس میں ایسے اصحاب کی تحریریں جمع ہیں جو مختلف زمانوں میں اقبال سے ملتے رہے۔ یہ سب تحریریں تاثراتی اور مشاہداتی نوعیت کی ہیں اور ان سب میں لکھنے والے کا اپنا رجحان طبع پوری شدت سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ بناء بریں ضروری ہے کہ اس طرح کی تحریروں سے صرف وہ واقعات قابلِ استشہاد سمجھے جائیں جن کی صراحت، کنایۃً یا اشارۃً اقبال کی اپنی تحریروں اور بیانات سے تائید ہوتی ہو۔

دوسروں کی مدون کردہ تحریروں میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اوقات اچھے اچھے معتبر اور ثقہ اصحاب سے ایسی ایسی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ جن کا ان کے مقام و مرتبہ اور علم و فضل کو دیکھ کر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سوانح اقبال کے سیاق و سباق میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ یہاں ایک مثال پیش خدمت ہے۔ اقبال اکیڈمی کے سابق ناظم اور ممتاز مفکر و ماہر اقبالیات جناب بشیر احمد ڈار نے انوار اقبال کے نام سے اقبال کی بہت سی غیر مطبوعہ تحریروں کا ایک مجموعہ ۱۹۶۷ء میں اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع کیا تھا۔ اقبال اکیڈمی اور مرتب کتاب دونوں کی ثقاہت کو دیکھتے ہوئے کون یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس کتاب میں جان بوجھ کر کس خوفناک تحریف سے کام لیا گیا ہوگا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی ایک تحریر میں اس کتاب میں دانستہ حذف و تحریف سے کام لیا گیا۔ اس کتاب کے صفحات ۴۵ تا ۴۹ پر اقبال کی دو تحریریں نبوت کے بارے میں نقل کی گئی ہیں۔ خوش قسمتی سے ان تحریروں کی عکسی نقول بھی شامل کتاب ہیں۔ ان میں سے پہلی تحریر میں اقبال نے نبوت کے دو بنیادی اجزاء وحی یعنی ملقی علم از ذرائع مابعد الطبیعی اور اس پر وجوب ایمان و عمل کے دعوے سے بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اب اس بات کا دعویٰ کرے کہ اس کی نبوت کے یہ دونوں اجزاء میسر ہیں تو وہ کاذب ہے اور واجب القتل ہے۔ پھر مسلمہ

کذاب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے بھی یہ دونوں دعوے کیے تھے، ہر چند کہ اس نے حضور علیہ السلام کی نبوت کا انکار نہ کیا تھا۔ لیکن چونکہ اس نے یہ دونوں باتیں اپنی ذات میں جمع کرنا چاہیں، اس لیے واجب القتل قرار دیا گیا۔ اس تحریر میں سے واجب القتل ہونے سے لے کر آخر تک یہ ساری بحث حذف ہے۔ جو اپنے اقتصاد اور جامعیت کے باوجود کئی سطروں پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب میں اس جگہ نقطے لگا دیے گئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اقبال اکیڈمی کے ناظم کی مرتب کردہ کتاب میں جو اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع ہو نبوت جیسے اہم اور نازک مسئلہ پر اقبال کی رائے میں حذف و تبدیلی سے کام لیا جائے تو پھر آخر اور کس کے بیان اور کس کی شہادت پر اعتبار کیا جائے؟ اس حیرت انگیز اور افسوس ناک دیدہ دلیری کے بعد نہیں کہا جا سکتا کہ دوسرے لوگوں نے اقبال کی جو تحریریں جمع کی ہیں۔ خاص طور پر جن اصحاب نے ملفوظات کے نام سے مجموعے مرتب کیے ہیں۔ ان کو کس درجہ میں قابلِ اعتماد و استناد سمجھا جائے؟

سوانح اقبال پر یوں تو کئی کتابیں لکھی گئیں۔ لیکن عام طور پر تین کتابیں متداول ہیں۔ سالک کی ذکر اقبال، طاہر فاروقی صاحب کی سیرت اقبال اور مولانا عبدالسلام ندوی کی اقبال کامل، آخر الذکر دونوں کتابیں اقبال پر لکھی جانے والی اولین کتابوں میں سے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اقبال کی سیرت پر ان کی وفات کے فوراً ہی بعد دو ایسے اصحاب کو لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی جنہوں نے شاید اپنی پوری زندگی میں ایک دو بار سے زائد اقبال کو دیکھا تک نہ تھا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رفیق مولانا عبدالسلام ندوی کی اقبال کامل اور پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر محمد طاہر فاروقی کی سیرت اقبال ابھی تک اپنے موضوع پر سب سے زیادہ جامع کتابیں ہیں۔ ہر دو اصحاب نے اُس وقت تک دستیاب انتہائی محدود ماخذ کے باوجود جس حسن و خوبی سے اپنے موضوع کا حق ادا کیا۔ اس کے احسان سے عاشقانِ اقبال اور ماہرینِ اقبالیات اس وقت سبکدوش ہو سکتے ہیں جب ان کے کیے کام کو مزید آگے بڑھائیں۔ لیکن اس جامعیت کے باوجود اقبال کامل میں سیرت و سوانح کا حصہ بہت تھوڑا ہے۔ کتاب کا ایک تہائی سے زائد حصہ اقبال کے کلام اور شاعری پر تبصرہ ہے اور تقریباً ایک تہائی حصہ میں ان کے فکر و فلسفہ سے بحث ہے اور باقی ماندہ حصہ سوانح سے تعلق رکھتا ہے۔

8

رہی سالک صاحب کی ذکر اقبال تو اس کو یوں تو ہمیشہ ہی ثقاہت کے معیار سے گرا ہوا سمجھا گیا۔ لیکن اب علامہ اقبال کے خاندان کے ایک شخص جناب خالد نظیر صوفی نے سالک کی بہت سی ایجادات

کی محکم دلائل کے ساتھ تردید کر دی ہے

(ص ۱۳۵-۱۴۱، اقبال درون خانہ)

صوفی صاحب لکھتے ہیں کہ اقبال کے خلاف جو بے سروپا باتیں پھیلائی جاتی رہی ہیں۔ اُن کے پھیلانے میں ایک مخصوص فرقے کے افراد کا ہاتھ کار فرما رہا ہے اور یہ لوگ محض اس بناء پر اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں تاکہ اپنی اس بین الاقوامی تذلیل کا انتقام لے سکیں۔ جو اقبال کے ہاتھوں انہیں اٹھانی پڑی تھی۔

(ص ۱۴۳ - حوالہ بالا)

اس معاملہ میں کمیونسٹوں اور اخلاقی وفکری اباحیت کے حامیوں نے بھی بے پر کی اڑانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس ضمن میں ایک اور کتاب کا بھی بہت نام لیا جاتا ہے۔ یہ عطیہ فیضی کی کتاب اقبال ہے جو اگرچہ اقبال کی سوانح نہیں ہے۔ لیکن اس کتاب نے اقبال کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اوّل تو ماہرینِ اقبالیات کے مذکورہ بالا انداز تحقیق کے پیشِ نظر اب کس کی تحریر اور کس بیان قابل اعتماد رہ جاتا ہے ظاہر ہے۔ دوسرے خود عطیہ کی اس کتاب میں ایسے بیانات اور دعاوی موجود ہیں جو خود اس کتاب کے استناد کا فیصلہ کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ مصنفہ کا دعویٰ ہے کہ اقبال ۱۹۱۱ء میں حیدر آباد کی نظر فریب بھڑک سے متاثر ہو کر اس کے گرویدہ ہو گئے اور عطیہ کو اندیشہ ہوا کہ وہ وہاں جا کر اپنی توجیہات کو اعلیٰ مقاصد کے بجائے معمولی کاموں کے لیے وقف کر دیں گے۔ حیدر آباد میں کوئی مادی منفعت حاصل کرنے کی غرض سے اقبال نے عطیہ بیگم سے بعض عمائدین حیدر آباد کے نام سفارشی رقعے بھی حاصل کیے۔ اور ان کے وسیلے سے ان عمائدین سے ملاقات کی۔ (ص ۴۷-۴۹)

مصنفہ کا دعویٰ ہے کہ وہ اقبال کی معلم اخلاق بھی تھی اور وقتاً فوقتاً ان کی نالائقیوں اور نااہلیوں پر ان کو ڈانٹتی رہتی تھی۔



(ص ۴۳ - ۴۸ - ۵۱ - ۵۷)

مصنفہ نے بیان کیا ہے کہ اقبال ایک عرصہ ایران میں بھی رہ چکے ہیں۔ (ص ۸۷) اس طرح کی بے بنیاد باتوں سے کتاب کی ثقاہت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

سوانح اقبال پر موجود کتابوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت اقبال

کی ایک جامع اور مستند سوانح عمری کا مرتب کرنا ماہرینِ اقبالیات کا اولین فریضہ ہے۔ اقبال کی ایک ایسی سوانح کا مرتب کرنا جو تمام علمی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اُردو کے سوانحی لٹریچر میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اب وقت کا اولین تقاضا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلم ہندوستان کے فکری، تہذیبی اور ثقافتی مسائل، مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی علوم کے مقابلہ میں مسلمانوں کا مؤقف، انیسویں صدی کے اواخر کے مذہبی رجحانات جنہوں نے سرسید اور مرزا غلام احمد قادیانی کو جنم دیا یہ سب مسائل حیات اقبال کا لازمی حصہ ہیں، جب تک ان سارے حالات سے گہری واقفیت نہ ہو، ان میدانوں میں اقبال کے کام کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ پھر خود پنجاب کی سیاسی اور اجتماعی تحریکات جنہوں نے اقبال کے تشکیلی دور میں ان پر اثر ڈالا۔ اقبال کے اپنے معاصرین سے روابط کی کیا نوعیت تھی۔ اس میں سیاست دان، علماء، صوفیہ اور وکلاء سبھی کرتے ہیں۔ اقبال کی شخصی زندگی کے وہ واقعات جن سے ان کی افتادِ طبع پر روشنی پڑتی ہے۔ پھر وہ اجتماعی اور ملی تحریکات جن میں اقبال نے خود عملی شرکت کی اور پھر اپنا انفرادی اثر چھوڑا۔ ان سب مسائل پر جامع علمی انداز میں روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ حیات اقبال کے انتہائی شخصی اور انتہائی عائلی نوعیت کے واقعات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا اور بیان کرنا غیر مفید بھی ہے اور ایک سخت قابل اعتراض حرکت بھی۔ اقبال نبی تو تھے نہیں، جن کی زندگی کا ہر پہلو انسانیت کے لیے درس اور نمونہ ہو۔ ان کی زندگی کا وہی پہلو قوم کے لیے مفید اور سبق آموز ہو سکتا ہے۔ جو ان کے اجتماعی اور ملی کاموں اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ باقی رہی کسی کی پرائیویٹ زندگی تو بقول رشید احمد صدیقی، جس طرح شرفاء کے محلہ میں بعض اوباش ہوا کرتے ہیں۔ جن کا کام زمانہ میں جھانکنا تاکنا ہوا کرتا ہے۔ اس طرح کچھ ادبی اوباش بھی ہوتے ہیں۔ جن کی ساری دلچسپی یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کی خالص شخصی زندگی کا کھوج لگایا جائے اور اس کے مزے لے لے کر بلکہ نمک مرچ لگا کر بیان کیا جائے۔ 10

ذیل میں بعض ایسے مصادر و مآخذ کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ جن سے حیاتِ اقبال کے اہم گوشوں کے بارے میں مستند معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اِس ضمن میں سب سے مستند مواد جن تحریروں سے دستیاب ہوتا ہے وہ فطری طور پر اقبال کی اپنی تحریریں اور ان کے اپنے قریبی دوستوں کی وہ تحریریں ہیں جو اقبال کی اپنی زندگی میں شائع ہو چکی تھیں۔ اس طرح کی تحریروں کے کچھ مجموعے بعض اصحاب نے شائع کیے ہیں۔ محمد رفیق افضل صاحب نے گفتار اقبال کے نام سے ایک مجموعہ ۱۹۶۹ء میں ادارہ تحقیقاتِ

پاکستان سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں مرتب نے ہندوستان کے بڑے بڑے اخبارات بالخصوص زمیندار اور انقلاب سے وہ تمام مواد جمع کر کے یکجا کر دیا ہے۔ جس سے حیات اقبال کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ اس مواد کی اہمیت کئی وجوہ سے دوچند ہو جاتی ہے۔ ایک یہ کہ یہ اقبال کی اپنی یا ان کے معاصر قریبی دوستوں کی تحریریں ہیں۔ دوم یہ کہ اس مواد کا اکثر حصہ خود اقبال کی زندگی میں شائع ہو چکا تھا۔ اور سوم یہ کہ قریب قریب یہ ساری تحریریں مختلف روزناموں میں شائع شدہ ہیں۔ ہزاروں افراد نے ان کو پڑھا۔ اگر ان میں کوئی غلط بیانی ہوتی تو اس کی تردید کرنے والے ہزاروں افراد موجود تھے۔ اس لیے ان تحریروں سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ وہ لوگوں کے ذاتی تاثرات اور شخصی خطوط سے کہیں بڑھ کر استناد اور اہمیت رکھتی ہیں۔ تاہم احتیاط کا تقاضا ہے کہ ان تحریروں کو اصل مصادر سے ملا کر دیکھ لیا جائے۔ رفیق افضل صاحب کی اس کتاب سے کئی ایسے مسائل پر عمدہ مواد ملتا ہے۔ جن سے سوانح اقبال پر دوسری کتب خالی ہیں۔ اقبال کو زندگی بھر مسئلہ فلسطین سے خاص دلچسپی رہی، افغانستان کی آزادی، استحکام اور خوشحالی کی ہر تحریک میں وہ متعدد بار حصہ لیتے رہے۔ افغانستان کی بقاء اور خوشحالی پر ہی برصغیر کے مسلمانوں کی بقاء اور خوشحالی کا مدار تھا اور ہے۔ ان سب چیزوں پر رفیق افضل صاحب نے مواد پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں سارے معاصر اخبارات و رسائل کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیئے۔ اخبار وکیل امرتسر میں ۱۹۱۵ء، ۱۹۱۶ء اور بعد کے کئی سالوں میں اقبال نے کئی مضامین ان اعتراضات کے جواب میں لکھے تھے جو اسرار خودی کی اشاعت کے بعد صوفیہ کے حلقہ میں بڑے زور شور سے کیے گئے تھے۔ علاوہ ازیں ٹربیون، اسٹیٹسمین، مسلم آؤٹ لک، امان اور ریلائٹ وغیرہ میں اقبال کے مضامین، خطوط، بیانات اور خبریں چھپتی رہی ہیں۔



اقبال نے کئی بار قومی اور ملی ضروریات سے بیرون ملک کا سفر کیا۔ اُن کے ان سفروں کی دو ایک مستند رودادیں بھی مرتب ہو گئی ہیں۔ حال ہی میں محمد حمزہ فاروقی صاحب نے سفرنامہ اقبال کے نام سے ایک وقیع کتاب پیش کی ہے۔ انہوں نے یہ کتاب مرحوم مولانا غلام رسول مہر کی زیر نگرانی اور اکثر و بیشتر انہی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں اور یادداشتوں کی مدد سے مرتب کی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب علامہ اقبال مرحوم دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو جاتے اور آتے وقت متعدد ممالک کی سیاحت کی۔ اس دوران آپ کا قیام مصر، اٹلی، فلسطین اور لندن وغیرہ میں رہا۔ اس سفر میں مولانا غلام رسول مہر اقبال کے سیکرٹری اور معاون کے طور پر ہمراہ تھے۔ وہ سفر کی کیفیات اور روداد وقتاً فوقتاً لکھ کر بھیجتے رہتے تھے۔

اور وہ ان کے اخبار 'انقلاب' میں چھپتی رہتی تھیں۔ مہر صاحب کی ایسی ہی بعض یادداشتیں غیر مطبوعہ بھی تھیں۔ اس کتاب سے حیاتِ اقبال کے بہت سے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں، جو انقلاب لاہور، الامان دہلی، لائٹ لاہور اور اس طرح کے مرحوم اخبارات و رسائل میں قریب قریب گم ہو چکے تھے۔ خاص طور پر سفر مصر و فلسطین اور وہاں کے اکابر سے ملاقوں کی جو تفصیلات مہر صاحب کے حوالے سے اس کتاب میں درج ہیں وہ نہایت دلچسپ قیمتی ہونے کے ساتھ ساتھ مستند اور معلومات افزا بھی ہیں۔ اس سے پہلی بار اس کام کی کچھ تفصیلات بھی سامنے آتی ہیں جو علامہ اقبال نے مصر و فلسطین کا نگریس نواز پریس کے بے بنیاد پروپیگنڈے کا زور توڑنے کے لیے کیا تھا۔ علامہ اقبال نے یہ سفر ۱۹۳۱ء میں کیا تھا اس زمانہ میں علمائے مصر اور مصر کے عام تعلیم یافتہ طبقہ نے جس جوش و خروش اور خلوص سے اُن کا استقبال کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کا نام اور پیغام ۱۹۳۱ء سے کافی پہلے بلاد عرب میں پہنچ چکا تھا۔

اقبال نے ایک اہم سفر ۱۹۳۳ء میں مسلم ہندوستان کی دو اور جلیل القدر علمی شخصیتوں کے ہمراہ افغانستان کا کیا تھا۔ اس سفر کی مفصل روداد اقبال کے رفیقِ سفر مولانا سید سلیمان ندوی نے بالاقساط رسالہ 'معارف' میں شائع کی تھی۔ یہ روداد اقبال کی نظر سے بھی گذری تھی اور انہوں نے اس کی تحسین کی تھی۔ بعد میں یہ سفرنامہ 'سیر افغانستان' کے نام کتابی شکل میں بھی چھپا۔



اقبال کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں میں ملفوظات اقبال بھی ہے۔ یہ دراصل پندرہ مختلف اصحاب کے شخصی تاثرات اور یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ گو یہ مجموعہ اقبال کی وفات کے فوراً بعد مرتب ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت کچھ عرصہ بعد ممکن ہو سکی۔ اس طرح کے دوسرے مجموعوں کی بہ نسبت اس میں شامل شدہ مواد مستند معلوم ہوتا ہے۔ لکھنے والوں میں شیخ عبدالقادر، میاں بشیر احمد اور سید عبدالوحد جیسے دیرینہ نیازمندان اقبال شامل ہیں۔ لیکن فطری طور پر اس مجموعہ کی ہر تحریر میں لکھنے والے کی شخصیت اور اس کے اپنے افکار و رجحانات کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ کئی اصحاب نے اقبال سے اپنی بے تکلفی اور قربت ظاہر کرنے کے لیے بعض ایسے دعوے بھی کئے ہیں۔ جن کی دوسری قوی تر شہادتوں اور مستند تر بیانات کی روشنی میں تردید ہو جاتی ہے۔ بایں ہمہ اگر تنقید و احتیاط سے کام لیا جائے تو یہ کتاب اقبال کی سوانح کے بارے میں مفید اور قابلِ قدر مواد پیش کرتی ہے۔

ملفوظات اقبال کے اس کے علاوہ دو بڑے مجموعے اور بھی ہیں۔ ایک فقیر سید وحید الدین کی کتاب

روزگارِ فقیر اور دوسرا سید نذیر نیازی صاحب کی اقبال کے حضور۔ دونوں اصحاب اقبال کے قریبی حلقۂ معتقدین سے تعلق رکھنے والوں میں سے ہیں۔ دونوں اصحاب نے اپنی اور دوسرے دوستوں کی یادداشتوں کی مدد سے اقبال کے فرمودات جمع کئے ہیں۔ اُن سے استشہاد کے ضمن میں بھی وہی اصول پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔ جو ایسی کسی بھی شہادت کو قبول کرنے میں پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اقبال کے ذاتی حالات، خاندانی واقعات اور اُن کے بہت سے افکار و نظریات پر مفید معلومات فراہم کرتی ہیں۔

اقبال درونِ خانہ کو بھی اسی صف میں جگہ ملنی چاہیئے۔ اگرچہ اس میں مؤلف نے غیر معمولی طور پر SUBJECTIVE اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ تاہم بیانات مستند اور وقیع ہیں۔ صہبا لکھنوی کی کتاب اقبال اور بھوپال بھی اس ضمن میں توجہ کی مستحق ہے۔ کتاب کا موضوع اگرچہ محدود ہے۔ لیکن چونکہ بعض اصحاب نے اقبال اور نواب صاحب بھوپال کے تعلقات کے بارے میں خاصی بے جا قیاس آرائیاں کی ہیں۔ اس لیے اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی نادر معلومات ملتی ہیں جو شاید دوسری جگہ دستیاب نہ ہو سکیں۔

13

اُردو کے علاوہ کسی اور زبان میں شاید اقبال پر کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو ان کی سوانح پر مستند اور ORIGINAL معلومات پیش کرتی ہو۔ انگریزی زبان میں اقبال کی اپنی تحریروں کے مجموعے تو ہیں۔ دوسروں کی تحریریں کم ہیں۔ عربی زبان میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کی کتاب محمد اقبال سیرتہ وفلسفتہ وشعرہ ہے۔ جس سے ان دونوں اصحاب کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ قاہرہ میں اقبال کی مصروفیات کے بارے میں بھی بعض ایسے معلومات ہیں جو اور جگہ نہیں ملتیں۔

یہ ہیں وہ بنیادی مآخذ جن کی مدد سے اقبال کی ایک مستند اور جامع سوانح عمری مرتب کی جا سکتی ہے۔ ثانوی مآخذ بہت سے ہیں۔ جن کی ایک مختصر فہرست ضمیمہ میں موجود ہے۔ آئندہ سال اقبال صدی منائی جا رہی ہے۔ کیا یہ ممکن نہ ہوگا کہ مجالسِ اقبال، شعبہ ہائے اقبال اور ماہرینِ اقبال میں سے کوئی کم از کم اس موقعہ پر اسی فرضِ کفایہ کی انجام دہی کر کے ملتِ پاکستان کو اس کی ادائیگی سے سبکدوش کر دے۔

# سوانح اقبالؒ کے ثانوی مآخذ

۱۔ مکتوبات اقبال از سید نذیر نیازی

سید نذیر نیازی صاحب قدیم نیازمندان اقبال میں سے ہیں۔ اقبال کی طویل علالت کے دَور میں نیازی صاحب سے ان کے خصوصی مراسم رہے۔ اقبال کی بیماری، علاج اور آخری تصانیف وغیرہ سے متعلق معلومات اس مجموعہ میں مل جاتی ہیں۔

14

۲۔ علامہ اقبال بھوپال میں از عبدالقوی دسنوی

یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں بھوپال میں چھپی ہے۔ اقبال اور بھوپال کے تعلق پر اس میں کارآمد معلومات ہیں لیکن اس موضوع پر اچھی اور عمدہ کتاب صہبا لکھنوی کی ہے۔ جس کا حوالہ اُوپر دیا جاچکا ہے۔

۳۔ تلمیحات اقبال از سید عابد علی عابد

کتاب کا موضوع اگرچہ کلام اقبال میں استعمال ہونے والی تلمیحات ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے کلام میں جابجا معاصرین اور اساتذہ وغیرہ کے نام بھی آئے ہیں۔ اس لیے ان کا بھی اچھا تذکرہ مل جاتا ہے

۴۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی

یہ خطوط جناب محمد عبداللہ قریشی نے مرتب کیے تھے اور ۱۹۶۹ء میں اقبال اکیڈمی کراچی نے ان کو شائع کیا۔ مولانا غلام قادر گرامی فارسی کے جید شعراء میں سے تھے، نظام کے استاذ اور اقبال کے گہرے دوست تھے۔ کتاب دلچسپ ہے۔

۵۔ اقبال اور عبدالحق از ممتاز حسن

چند متفرق مضامین اور تحریروں کا یہ مجموعہ ۱۹۷۳ء میں اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت پر لاہور سے چھپا تھا[1]۔ اقبال کا نام اس میں شاید تبرکاً ہی شامل کر لیا گیا۔ ورنہ اقبال کے بارے میں کوئی

---

[1] ۔ اس وقت اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ء تھی۔ اس لیے ۱۹۷۳ء میں جشنِ ولادت منایا جاچکا تھا۔ اب ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء ان کی تاریخ پیدائش قرار دی گئی ہے اس لیے اب ۱۹۷۷ء میں ایک بار پھر صد سالہ جشنِ ولادتِ اقبال منایا جائے گا۔

خاص بات تو معلوم نہیں ہوتی۔

**۶۔ نذرِ اقبال از سر عبدالقادر، مرتبہ محمد حنیف**

سر عبدالقادر اقبال کے دیرینہ دوستوں میں سے تھے۔ اقبال کی زندگی اور فکر کے مختلف پہلوؤں پر اُن کے مضامین کا یہ مجموعہ شاعرِ مشرق کے بارے میں ان کے ایک دوست کے قلبی تاثرات کا بھی آئینہ دار ہے۔

**۷۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ از محمد احمد خان**

اس کتاب میں اگرچہ اقبال کی سوانح کے بارے میں کوئی ٹھوس بات نہیں ملتی تاہم مصنف نے اقبال کی سیاسی زندگی کے ذہنی اور فکری پس منظر اور نظریاتی محرکات کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔

15

**۸۔ فکرِ اقبال از خلیفہ عبدالحکیم**

خلیفہ صاحب مرحوم پاکستان کے جید اصحابِ علم و فکر میں سے تھے۔ ان کی یہ فاضلانہ کتاب اگرچہ شعر و فکرِ اقبال سے متعلق ہے۔ لیکن اس میں جا بجا دوسری معلومات بھی ملتی ہیں۔ بعض جگہ مصنف مرحوم کے شخصی تاثرات بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔

**۹۔ اوراقِ گم گشتہ از رحیم بخش شاہین**

**۱۰۔ شاد و اقبال از محیؒ الدین قادری زور**

اس کتاب میں اقبال اور حیدر آباد دکن کے وزیرِ اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کے تعلقات کے بارے میں عمدہ مواد ملتا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۲ء میں حیدر آباد دکن میں چھپی تھی۔ اب تقریباً ناپید ہے۔

**۱۱۔ اقبال کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی، از ظہیر الدین جامعی**

یہ کتاب اقبال کی سوانح پر لکھی جانے والی اچھی کتابوں میں سے ہے۔ واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔

**۱۲۔ مضامینِ اقبال از محمد حسین تاج**

**۱۳۔ آثارِ اقبال از غلام دستگیر**

یہ کتاب اقبال پر لکھے جانے والے بہت سے مقالات کا ایک مجموعہ ہے۔ جو ستمبر ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں ایک مضمون مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا بھی ہے۔ جو طلبۂ اقبال کے لیے تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔

۱۴۔ اقبال پر ایک نظر، سیّد محمد شاہ

۱۵۔ حیاتِ اقبال، شائع کردہ تاج آفس

۱۶۔ سیرتِ اقبال از ذکیا حقانی

16

۱۷۔ اقبال، شائع کردہ انجمن ترقیٔ اردو

یہ مجموعہ مضامین مولوی عبدالحق نے مرتب کیا تھا اور پہلی بار اکتوبر ۱۹۳۸ء میں اورنگ آباد سے شائع ہوا تھا۔ اس میں بعض مضامین اچھے ہیں۔

۱۸۔ مقامِ اقبال از اشفاق حسین

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد دکن میں چھپی تھی۔ یہ کتاب اقبال کی سوانح سے تو نہیں، ہاں اُن کے فکر و فلسفہ سے اچھی بحث کرتی ہے اور فکرِ اقبال پر لکھی جانے والی اچھی کتابوں میں سے ہے۔

۱۹۔ اقبال از محمد حسین خان

۲۰، ۲۱۔ شرح اسرارِ خودی اور شرح جاوید نامہ از سلیم چشتی

چشتی صاحب کی یہ اور دوسری شروح کلامِ اقبال کی صوفیانہ تعبیرات و تشریحات کا شاید سب سے عمدہ نمونہ ہیں۔ شرح اسرارِ خودی میں اس ہنگامہ کی تفصیل مل جاتی ہے جو اسرارِ خودی کی اشاعت پر صوفیہ اور مدّاحان حافظ کے ایک حلقہ نے اقبال کے خلاف کھڑا کر دیا تھا۔ شرح جاوید نامہ میں ایسے بہت سے اشخاص کے حالات مل جاتے ہیں جن سے اقبال متاثر یا اُن کے مداح تھے۔

۲۲۔ اقبال نامہ از شیخ عطاء اللہ

یہ کتاب اقبال کے خطوط کا اوّلین مجموعہ ہے جو اُن کی وفات کے فوراً ہی بعد مرتب ہو گیا تھا۔ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ ابھی تک اس کا شاید ایک ہی ایڈیشن نکل سکا ہے۔ ورنہ کتاب اس قابل تھی، کہ اس کے متعدد ایڈیشن نکلتے۔ اس میں مندرج بعض خطوط کے استناد (مثلاً ڈاکٹر لمعہ کے نام والے خطوط کے استناد) میں بعض اہلِ علم نے شک کیا ہے۔

## ۲۳۔ اقبال کے آخری دو سال از عاشق حسین بٹالوی

یہ ضخیم کتاب اقبال کی سیاسی زندگی کے بارے میں بہت سی تفصیلات فراہم کرتی ہے اقبال نے اپنی آخری زندگی میں مسلم لیگ اور قائداعظم سے جو توقعات قائم کی تھیں اور جس طرح انہوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ اُس کا اچھا تذکرہ ہے۔ لیکن بعض جگہ مصنف کا لہجہ اپنے سیاسی مخالفین کے بارے میں ذرا سخت ہوگیا ہے۔

## ۲۴۔ اقبال اور حیدرآباد از نظر حیدرآبادی

یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں کراچی میں اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔ اسلامی ہند کی ریاست حیدرآباد دکن اور اس کے اصحاب علم وفضل کے ساتھ اقبال کے روابط کا اس میں اچھا تذکرہ آگیا ہے۔

17

## ۲۵۔ روائع اقبال از سید ابوالحسن علی ندوی

یہ کتاب عربی میں علامہ اقبال کی زندگی اور پیغام کے بارے میں لکھی جانے والی اُن دو ایک کتابوں میں سے ہے۔ جنہوں نے عربی بولنے اور سمجھنے والی دنیا میں شاعر مشرق کی آواز کو متعارف کرایا مصنف نے اقبال سے اپنی دو ایک ملاقاتوں کی تفصیل بھی دی ہے۔ عربی میں اُس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اُردو ترجمہ بھی نقوش اقبال کے نام سے ہوچکا ہے اور کراچی اور لکھنؤ سے کئی بار چھپ چکا ہے۔

## ۲۶۔ رسالہ جوہر اقبال نمبر

---